پیاری زینب،

بابا کی جان، جب بھی آپ کو اپنی کتابوں میں مشغول دیکھتا ہوں تو دل مسرّت سے بھر جاتا ہے۔ محض چودہ برس کی ہیں، لیکن کس قدر باشعور ہیں آپ۔

آج یوں ہی کھیلتے دوران جب آپ نے ہماری دراز سے اپنی دادی، یعنی ہماری پیاری امّاں کا پرانا خط نکالا، تو ان کی اردو کی کتابت دیکھ کر دل بھر آیا۔ وہ اکثر رات کو سونے سے قبل اپنی کتابوں سے ڈھونڈ کر ہمیں کہانیاں سناتیں۔

جس کسی روز شہر میں کوئی مشاعرہ ہوتا، تو امّاں عجلت سے دن تمام گھر کے سارے کام کاج سمیٹ لیتیں اور پھر ہمیں اور آپ کی پھوپھو کو تیار کر کے فوراً گھر سے روانہ ہو جاتیں۔

دیوار پار ایک چھوٹا سا مدرسہ بھی ہوا کرتا تھا، جو تقی صاحب، جنہیں ہم خلوص سے پھوپھا کہا کرتے تھے، ان کی بیٹیاں باقاعدگی سے عصر سے مغرب تک چلاتی تھیں۔ سو روپے کے عوض دولتِ علم سے نواز جاتی تھیں۔

ہماری اردو سے محبت کا آغاز بھی اسی مدرسے میں دورانِ تعلیم ہوا۔ ایک وہ مدرسہ، اور دوسرا فرشِ عزا۔ میر انیس کے مرثیے زبانی یاد کر لیے، بیک وقت دبیر کے اشعار بھی۔

بچپن میں ابّا ایک مرتبہ حضرت نظام الدین کی درگاہ موقعِ بسنت پر لے گئے۔ ہم جا کر ایک قوال کے پاس بیٹھ گئے، جو اپنی دھن میں مگن، خسرو کی ایک غزل پڑھ رہے تھے—

زِ حالِ مسکیں مکن تغافل دُرائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں، نہ لے ہو کاہے لگائے چھتیاں

کانوں میں اذان کی مانند گونجتی رہی یہ غزل ہماری روح میں اتر گئی!

اس غزل کا اکثر تعلق امیر خسرو سے دیا جاتا ہے، مگر کچھ محققین کا کہنا ہے کہ اس کی تصدیق کرنا کافی مشکل ہے۔ بہرحال، اس غزل میں مختلف زبانوں، ہندوی اور فارسی، کو ایک ہی غزل میں پرو لینے کا فن موجود ہے۔

وہیں دکن میں محمد قلی قطب شاہ نے اسی زبان کو اپنے دیوان کے ذریعے ایک نیا مقام عطا کیا۔ جانتی ہیں، انہیں اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر قرار دیا جاتا ہے۔

آپ کے دادا حضور، خدا ابّا جان کی مغفرت فرمائے، نے ہمیں اس تعلق سے ولی دکنی کا نام بچپن ہی میں ذہن نشین کروا دیا تھا۔ اردو غزلیں تو ریختہ کی صورت میں ان سے پہلے بھی لکھی پڑھی جاتی تھیں، لیکن ان پر فارسی کا غلبہ شدید تھا۔ ہندوستان میں شاعری کا رخ فارسی سے اردو کی جانب رجوع ولی دکنی ہی کے زیرِ مہر بانی ہوا۔ ویسے تو ولی صاحب کی جائے پیدائش کے حوالے سے دانشوروں میں کافی اختلافات ہیں، لیکن ولی دکنی نے بہ ذاتِ خود اس بحث پر وقفِ لازم ایک شعر سے لگا دیا—

ولی ایران و توراں میں ہے مشہور
اگرچہ شاعرِ ملکِ دکن ہے

زینب، میری خواہش ہے کہ آپ کبھی مرزا محمد رفیع سودا کے بھی اردو قصیدے پڑھیں۔ ان کی پُرجوش زبان اور شان و شوکت میں آپ کو اردو کا ایک نیا لطف ملے گا۔

میری بیٹی، اردو زبان نے اپنی طویل زندگی کبھی شاہی آغوشوں میں گزاری، تو کبھی جیل کے اندھیروں میں۔ بہادر شاہ ظفر، جس نے مرزا ذوق اور پھر غالب کو پناہ دی، اور آگے چل کر انگریزی حکومت سے شہر بدر کر دیے گئے تھے، ان کا غم اگر کوئی زبان اپنے اندر سمو سکی، سہہ سکی، تو وہ اردو ہی تھی——

بلبل کو باغباں سے نہ صیاد سے گلہ
قسمت میں قید لکھی تھی فصلِ بہار میں
کتنا ہے بد نصیب ظفرؔ دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

اسی اردو غزل میں، بعد کی نسلوں میں، عشق کی نزاکت اور زبان کی شگفتگی کو اپنے خاص اندازِ بیان سے داغ دہلوی نے بھی امر کر دیا۔ یہی اردو، جو ظفر کے درد اور امیدوں کا بوجھ اٹھائے آگے بڑھی، اسے پھر علامہ اقبال نے بھی اپنے زورِ قلم سے نئی زندگی عطا کر دی——

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

ویسے تو ہم نے اقبال کے کچھ بول اپنے اسکول میں گائے جانے والے *'سارے جہاں سے اچھا'* سے سیکھے، یا پھر *' لب پہ آتی ہے دعا'* سے۔ جانتی ہیں، اعظم گڑھ کے ایک اسکول میں یہی دعا پڑھانے پر پرنسپل کو جیل تک ہو گئی تھی۔ لیکن دعائیں تو سب کی ہوتی ہیں اور سب کے لیے ہوتی ہیں۔ ان پر جیل بھی ہو تو کیا مضائقہ، پہنچ تو گئی خدا تلک۔

ایک روز امجد صابری کے انتقال کی خبر سنی۔ اس روز یوٹیوب پر ڈھونڈ کر، ان کی زبانی *جوابِ شکوہ* سنا۔ یقین مانو زینب، معطر ہو گئے ہم تو۔

اس بات سے ایک قصہ یاد آیا۔ اقبال صاحب کے دوست مولانا حسرت موہانی صاحب ہمیشہ تھرڈ کلاس کی بوگی میں سفر کیا کرتے تھے۔ کسی نے ایک دن پوچھ لیا کہ "بھائی مولانا، آپ تھرڈ کلاس میں کیوں سفر

کرتے ہیں؟ پارلیمنٹ بھی ٹانگے سے جاتے ہیں، اور سرکاری مکان میں رہنے کے بجائے مسجد میں رات گزارتے ہیں۔" تو مولانا نے بڑے ہی ادب کے ساتھ جواب دیا کہ "بھائی، میں تھرڈ کلاس میں اس لیے سفر کرتا ہوں کیونکہ ابھی تک فورتھ کلاس بنی نہیں۔" کیا ہی شخصیت تھے!

یاد ہے، ہم آپ کو لکھنؤ لے کر گئے تھے؟ بچپن ہمارا مشاق گنج کی گلیوں میں گزرا، آتے جاتے رفاہِ عام کلب کو دیکھتے۔ کبھی وہاں میلہ لگتا، کبھی نمائش، تو کبھی ولیمے کی دعوت کا انتظام۔ اب تو ٹوٹا پڑا ہے، کوڑے گھر کی طرح۔ نہ جانے کس بات پر، لیکن اُس زمانے کے شعرا و ناول نگاروں اور صحافیوں کو لگا کہ سب کو ایک ساتھ ایک چھت کے نیچے آنا چاہیے۔ بس پھر کیا تھا، رفاہِ عام کلب کو منتخب کیا گیا۔ سب ہی لوگ جمع ہوئے اور لگے ہاتھ آل انڈیا پروگریسیو رائٹرز ایسوسی ایشن (AIPWA) کی صدارت ہو گئی۔ رفاہِ عام کلب میں پہلا جلسہ ہوا، جس میں منشی پریم چند نے صدارتی خطبہ دیا۔

زینب، کیا آپ کو یاد ہے، اسی رفاہِ عام کلب کے بغل میں سٹی اسٹیشن ہے، جس کی آغوش میں خدائے سخن میر تقی میر دفن ہیں؟ مغلیہ سلطنت کے زوال اور دلی کی تباہی کے بعد، اٹھارویں صدی میں میر لکھنؤ چلے آئے تھے، جہاں انہیں نواب کے دربار میں سرپرستی موصول ہوئی۔ مگر میر کبھی لکھنؤ کو بطورِ گھر اپنا ہی نہ سکے—

دلی کے نہ تھے کوچے، اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی، تصویر نظر آئی

کوئی شخص دلی سے تو نکل آئے، لیکن دل سے دلی کیسے نکالے بھلا؟ مگر بہت ہی افسوس کی بات ہے کہ جب شہر کے سٹی اسٹیشن کے آس پاس ریلوے لائن بچھائی جا رہی تھی، تب میر کی قبر کھو گئی۔ اس بات پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔

جو دلی میر کے دل سے نہ نکل سکی تھی، اسی دلی کی فضا میں نظیر اکبرآبادی نے بھی اردو نظم کو ایک نئی وسعت بخشی۔ اور ادھر لکھنؤ کی ادبی محفلوں میں امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش نے ریختہ کی روایت اور اردو سے اپنی محبت کو اپنی زبان کی نفاست سے نکھارا۔

بہرحال، محبت عورت سے ہو، وطن سے، یا زبان سے، ہمیشہ سیاست، اقتدار اور مفاد پرستی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ عورت، چاہے وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے نہ کرے، گھر، دفتر، اور معاشرے کی تمام تر ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاتی ہے۔ عورت کی سوچ اور زبان پر پابندیاں بھی ہر دور میں رائج رہی ہیں۔ جب اکثریت میں حوصلہ نہ تھا، تو کشور ناہید نے ان تمام عورتوں کی زبان میں لکھنا شروع کیا۔ ان عورتوں کی خاموشی کو صدا بخشی جو اپنے حقوق اور جذبات کا اظہار کرنے سے خائف تھیں۔ نظم 'ہم گنہگار عورتیں' ان کی مقبول ترین نظموں میں سے ہے، جس میں انہوں نے اس عمل کو انجام دیا۔

دیش انگریزوں سے آزاد ہو چکا تھا، مگر کیا عورتوں کو یہ آزادی حاصل تھی؟ جواب مثبت نہیں۔ پھر بھی، یہی 'گنہ گار' عورتیں *'Quit India Movement'* سے لے کر *'Abducted Persons (Recovery and Restoration) Act'* تک قدم قدم پر آدمیوں کے ساتھ یکجا چلیں۔ آپ کی دادی، نانی اور امّی بھی ان دلیر عورتوں میں شامل تھیں جو ہر جنگ کے مقابل مضبوط، بے باک و بے خوف کھڑی رہیں۔

ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور ہر طبقے کے لوگ شانہ بہ شانہ، اپنے اختلافات بھلا کر انگریزی حکومت کے خلاف کھڑے ہوئے تھے۔ آپ کے پردادا بھی اس تحریک کا حصہ تھے۔ اپنے دوست کے ایک اردو اخبار میں انگریزوں کے خلاف تحریر کیے ہوئے ایک مضمون کے نتیجے میں انگریزی حکومت نے انہیں مہاتما

گاندھی کے ساتھ جیل میں ڈال دیا تھا۔ ان کے بند پڑے، مقفل دفتر کی الماریوں میں آج بھی وہ تمام خطوط اور تصاویر موجود ہیں جو ان کی آزادی کی جنگ، اور مہاتما گاندھی کے ساتھ گزرے لمحوں کا خزینہ ہیں۔

۱۹۴۷ میں بالآخر ہندوستان کو آزادی ملی۔ انگریزوں سے ہمیں آزادی تو حاصل ہو گئی، لیکن نتیجتاً ہماری مقدس زمین دو حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی—ہندوستان اور پاکستان۔ انہوں نے نہ صرف ہماری زمین کو دو حصوں میں بانٹ دیا، بلکہ نفرت اور فرقہ پرستی کے بیج ملکی باشندوں کی سوچوں میں اس قدر بو دیے کہ آج تک دونوں ممالک اس نفرت سے پنپی دشمنی کو بخوبی نبھا رہے ہیں۔ تقسیم کے دردناک حالات کے درمیان، آپ کی دادی ہندوستان میں رہ گئیں اور ان کے بھائی پاکستان ہجرت کر گئے۔ اپنے آخری دم تک وہ اپنے بھائی کو یاد کر کے رویا کرتیں۔

آزادی تو حاصل ہوئی، مگر کیا یہ وہی آزادی تھی جس کا ہم سب کو انتظار تھا؟ فیض احمد فیض اپنے الفاظ میں، نظم 'صبحِ آزادی' میں فرماتے ہیں—

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

واقعی یہ وہ سحر نہ تھی۔ ملک کے بٹوارے کے بعد، ہندوستان اور پاکستان میں تمام سیاسی دشواریاں اور مصیبتیں بڑھ گئیں۔ ۱۹۷۷ میں جہاں ہندوستان 'ایمرجنسی' کے گھیرے گھاؤ سے ابھر رہا تھا، وہیں پاکستان میں ضیاء الحق کی حکومت نے اپنی قومی طاقت بڑھانے کے لیے فوج کا زور بڑھایا اور مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ ان مشکلات کے درمیان، کچھ افراد، مثلاً شاعر فیض احمد فیض اور فنکارہ اقبال بانو، انقلاب کی مثال بن کر ابھرے۔ ۱۳ فروری ۱۹۸۶ کو لاہور کے الحمرا آرٹس کونسل میں اقبال بانو نے بھرے مجمعے میں سیاہ ساڑھی اور لال لپ اسٹک میں ملبوس، 'ہم دیکھیں گے' گایا۔ ساڑھی بھی منع تھی، اس نظم پر بھی پابندی تھی۔ باوجود اس کے، کہتے ہیں، رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر تھا۔

گڑیا، جب محرم کے دوران ساری خواتین حسین صاحب کے گھر میں جمع ہوتیں، تو اکثر مجلس ختم ہونے کے بعد آپ کی دادی چھپ کر منبر پر چڑھ جاتیں اور حبیب جالب کی کوئی نظم پڑھ دیتیں۔ وہ کہتی تھیں کہ جالب کے الفاظ میں ظلم اور تاناشاہی کے خلاف ایک دیوار کے مانند کھڑے ہونے کی طاقت ہے۔ 'شاعرِ عوام' کے خطاب سے نوازے گئے جالب آپ کی دادی کے لیے کسی 'ہیرو' سے کم نہیں تھے۔

۱۹۵۹ میں جب جنرل ایوب خان نے پاکستان میں مارشل لا کا اعلان کیا تو تقریباً سب ہی میڈیا ہاؤسز اور ذرائعِ ابلاغ کو سختی سے حکومت کے خلاف لکھنے سے منع کر دیا گیا۔ اس ماحول کے بیچ ریڈیو پاکستان نے ایک شعر و شاعری کی نشست منعقد کی۔ جہاں سب ہی شاعروں نے 'محبوب پاکستان' اور حکومت کے لیے غزل اور شعر پیش کیے، وہیں حبیب جالب تھے جنہوں نے ریڈیو پر اپنی نظم پڑھتے ہوئے اظہار کیا—

کہیں گیس کا دھواں ہے، کہیں گولیوں کی بارش
شبِ عہدِ کم نگاہی تجھے کس طرح سراہیں

اس نظم کے نشر ہونے کے فوراً بعد ہی ریڈیو اسٹیشن پر چھاپا مارا گیا اور اگلے دن حبیب جالب اور ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر کو گرفتار کروا دیا گیا۔ گڑیا، آج جب اس واقعے کو یاد کرتا ہوں، تو اُس وقت کے پاکستان اور آج کے ہندوستان کے درمیان کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔

رمضان کا مبارک مہینہ شروع ہونے والا ہے، میری بچی۔ ہمارے بچپن میں ہر سال ہم سب کو عید کا بڑی بے صبری سے انتظار رہتا تھا۔ پورے دن عیدی اکٹھی کرتے اور شام کو سیدھا فلم کیسٹ کی دکان پر پہنچ جاتے۔ ایک مرتبہ، رمضان شروع ہونے سے ایک ہفتہ پہلے آپ کے دادا ابّو نے آپ کی دادی جان کو ان کی سالگرہ کے موقع پر ایک وی سی آر پلیئر دلایا تھا۔ اب رمضان کے پورے مہینے تو وہ چلا نہیں، مگر عید کے دن صبح سے لے کر رات تک خوب استعمال ہوا۔

اب وی سی آر پلیئر آپ کی دادی کے لیے لایا گیا تھا، تو پہلی فلم کے لیے انہی سے ان کی پسند پوچھی گئی۔ ہنس کر بولیں، ”پیاسا دیکھیں گے۔“ ہمارا کوئی ڈِشوم ڈِشوم والی فلم دیکھنے کا خواب تو وہیں ریزہ ریزہ ہو گیا۔ منہ بسورے *‘پیاسا’* کا کیسٹ کرائے پر لے آئے اور گھر آتے ہی سب لوگ ڈرائنگ روم میں آ جمع ہوئے۔ فلم شروع ہوئی، اور جیسے جیسے کہانی آگے بڑھی، ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ گرو دت کا مظلوم اور جذباتی شاعر کا وہ کردار... **اُف!** اس کی کہانی نے سب کو بے چین کر دیا۔ لیکن ایک بات سب سے گہری چھاپ چھوڑ گئی—ساحر لدھیانوی کا لکھا گیت ”جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں“۔ ہم تب کافی کم عمر تھے، زینب، مگر ساحر کی لکھائی نے ہمیں اُس عمر میں بھی گہری سوچ میں مبتلا کر دیا۔ ساحر نے ہندوستان کے اُس طبقے پر سوال اٹھایا جو اپنے آپ کو وطن کے افتخاری محافظ تو سمجھتے ہیں، مگر جب عورتوں کو مجبوراً طوائف بنا دیا جاتا ہے، مزدور کو غربت کے دلدل میں دھکیل دیا جاتا ہے، عام انسان کو نظامی ظلم تلے کچل دیا جاتا ہے، تب یہی محافظ اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر خاموش تماشائی بن جاتے ہیں۔

بس پھر کیا تھا، ہم ساری عیدی لیے کتب خانے پہنچ گئے اور ساحر کی تمام کتابیں خرید ڈالیں۔ جب گھر آ کر کتابوں کے صفحات پلٹ رہے تھے، تو ایک کتاب میں ہمیں ”تاج محل“ لکھا نظر آیا۔ ہمیں پہلی بار تاج محل دیکھنے کا موقع ملا جب آپ کے دادا کو آگرہ ایک مشاعرے میں بلایا گیا تھا۔ مگر اُس روز یہ خواب بھی ذرّہ ذرّہ ہو گیا جب ہم نے ساحر کی نظم *‘تاج محل’* پڑھی۔ اپنی نظم میں ساحر نے اُن تمام مزدوروں کی قربانیوں کو بے پردہ کیا جنہوں نے تاج محل تو بنایا، مگر جن کی پہچان تاریخ کے صفحات میں گم ہو گئی۔ وہ تاج محل جسے محبت کی مثال کے طور پر بیچا جاتا ہے، اسے ساحر نے سماجی و معاشی ناانصافی کی نشانی ظاہر کیا۔

اُس دن کے بعد سے جب بھی تاج محل کا ذکر ہوتا، تو ہمارے ذہن میں ساحر کا لکھا وہ مصرع ابھر آتا ہے—

ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

پچھلے ہفتے جب ہم آپ کے دادا کی الماری صاف کر رہے تھے، یاد ہے، تب آپ کو ان کپڑوں کے ڈھیر میں کچھ تصاویر اور خطوط ملے تھے۔

وہ تصاویر اور خطوط جیسے ہی ہمارے سامنے آئے، پرانی یادوں کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ لکھنؤ میں آپ کے دادا کے ایک بڑے ہی عزیز دوست تھے، ڈاکٹر افضال احمد۔ آپ کے دادا ہمیشہ انہی کے گھر جا کر ٹھہرتے تھے۔ پیشے سے تو افضال میاں وکیل تھے، مگر اردو ادب کے بڑے محافظ اور شاعر بھی تھے۔

افضال میاں اور ان کے والد دونوں ہی مشہور شاعر آرزو لکھنوی کے پسندیدہ شاگردوں میں سے تھے اور ان ہی کے نام سے ایک 'انجمنِ آرزو' نامی تنظیم چلاتے تھے۔ افضال میاں اسی تنظیم کے ذریعے مشاعروں، اردو محفلوں اور تہذیبی پروگراموں کا انتظام کیا کرتے، جن میں سرحد پار کے مشہور شعرا بھی شرکت کیا کرتے۔ فیض احمد فیض، احمد فراز، افتخار عارف، بشیر بدر، سراج لکھنوی جیسے نامور شعرا، اور خود آرزو لکھنوی، ان مشاعروں کی شان بڑھاتے۔ صرف شعرا ہی نہیں، بلکہ کئی مشہور فن کاروں نے بھی 'انجمنِ آرزو' کے مشاعروں میں حصہ لیا، جن میں پرتھوی راج کپور اور بیگم اختر جیسے نمائندے بھی شامل ہیں۔

جو خطوط آپ کے دادا کی الماری میں ملے، وہ انہی مشہور شعرا اور ادبی شخصیات کے تھے، جو تقسیم کے بعد بھی افضال میاں کو غزلیں اور شاعری لکھ کر بھیجا کرتے۔ افضال میاں نے ان میں سے کچھ خاص خطوط آپ کے دادا کو بطورِ تحفہ دیے تھے۔

اِن میں سے جب ہم فہمیدہ ریاض کا افضال میاں کو لکھا ہوا خط پڑھ رہے تھے، تو اُس میں انہوں نے نہ صرف افضال میاں کے سو سالہ قدیم گھر اور ان کی زوجہ سیمی کے ہاتھ کے رَساوَل کا ذکر کیا، بلکہ کچھ تصویروں کا بھی حوالہ دیا جو جامعہ یونیورسٹی میں فہمیدہ جی کے کسی شاگرد نے کھینچی تھیں، جب ہم، افضال میاں اور ابّا حضور ان سے دلی ملنے گئے تھے۔

اُن دنوں فہمیدہ ریاض جامعہ ملیہ اسلامیہ میں *'Poet in Residence'* تھیں۔ پاکستان میں سیاسی دباؤ اور تحقیقات کے سبب فہمیدہ جی نے ہندوستان میں سات سال تک پناہ لی۔ ہمیں آج بھی وہ منظر یاد ہے جب فہمیدہ پھوپھو نے ہمیں اپنی گود میں بٹھا کر اپنی نظم *'ایک لڑکی سی'* سنائی تھی۔ سننے کے بعد ہم نے بڑی معصومیت سے ان سے سوال کیا، ''کیا ہماری امّی بھی قید ہیں؟'' قہقہہ لگا کر بولیں، ''تھیں، اب آزاد ہیں۔''

دیکھتے ہی دیکھتے کچھ اور لوگ وہاں تشریف لے آئے اور وہ چھوٹی سی ملاقات ایک محفل میں تبدیل ہو گئی۔ لوگ اپنی اپنی شاعری، اپنی نظمیں پڑھنے لگے۔ جب ابّا حضور کی باری آئی تو وہ کچھ گھبرا گئے۔ انہوں نے اپنے دیوان کا صفحہ پلٹا، مگر ان کے منہ سے آواز نہ نکلی۔ فہمیدہ پھوپھو ان کی گھبراہٹ سمجھ گئیں اور مسکرا کر دھیرے سے بولیں، ''شاعر کا دل دھڑک رہا ہو، تبھی اس کے الفاظ اثر کرتے ہیں۔''

آپ کے دادا نے انہیں ایک نظر دیکھا اور پھر نظریں جھکا کر بولے، ''ہم نے ریختی میں کچھ اشعار لکھے ہیں جو ہماری بیگم کے جذبات اور ان کی مصروف زندگی سے متاثر ہیں۔ سوچا تھا یہ اشعار خود تک محفوظ رکھوں گا، لیکن آج اس محفل میں پیش کرنے کی ہمت کر رہا ہوں۔''

آپ کے دادا کا کلام سننے کے بعد فہمیدہ پھوپھو ہلکا سا مسکرائیں، پھر افضال میاں کی طرف دیکھ کر بولیں، ''آپ کے دوست کو ساجد سجنی لکھنوی سے ملوانا چاہیے۔'' ساجد سجنی لکھنوی تھے تو لکھنؤ کے، مگر رہائش بھوپال کی تھی۔ وہ ریختی کے آخری مشہور شاعر تھے۔ انہوں نے ایک مرد ہو کر عورتوں کی جنسی خواہشات اور جذبات کو پوری آزادی کے ساتھ، انہی کی آواز میں، اپنی شاعری میں بیان کیا۔ مگر آپ کے دادا اور دادی کی ہمیشہ اس موضوع پر بحث ہو جاتی کہ ریختی ہمیشہ مردوں نے لکھی اور مردوں کے لیے ہی لکھی گئی۔ آپ کی دادی کا ماننا تھا کہ ایک عورت کے جذبات کو صرف ایک عورت ہی صحیح طرح سمجھ اور بیان کر سکتی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک عورتیں خود اپنی کہانیوں کو شاعری کے ذریعے پیش نہیں کریں گی، تب تک وہ اپنی حقیقت کو سماج کے سامنے نہیں لا پائیں گی۔ آج آزادی کے اناسی سال بعد بھی جب عورتوں کے حالات دیکھتا ہوں، تو سوچتا ہوں، کہیں نہ کہیں ان کی بات درست تھی۔

ایک روز جب آپ کے دادا اور دادی آنگن میں چارپائی پر نشیں ریختی کے مسئلے پر ہی بحث کر رہے تھے، تبھی انہیں افضال میاں کا فیکس آیا، جس میں انہوں نے صاحبہ پروین شاکر کے سڑک کے حادثے اور نتیجتاً انتقال کی اطلاع دی۔ دادا فوراً ہی اٹھے اور اپنی چھڑی کا سہارا لیتے ہوئے کمرے کی طرف چل پڑے۔

کمرے میں دیکھا تو وہ اپنی پرانی کتابوں کے صندوق کو کھول کر ایک پرانی ڈائری نکال بیٹھے تھے۔ اس ڈائری میں پروین شاکر کے اپنے ہاتھ سے لکھے کچھ اشعار اور ان کی ایک تصویر تھی۔ دادا نے تصویر کو دھیرے سے چوما اور ڈائری کو اپنے سینے سے لگا کر ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ دادی ان کے پاس آئیں، مگر دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہ کہا۔ پروین شاکر ابّا کے لیے بہن کے مانند تھیں۔ پروین پھوپھو ہی کی وجہ سے ان کے ذوق اور تحریر میں لا اُبالیلڑکیوں کی آواز اور ان کے مسائل کو جگہ ملی۔ صرف بیالیس سال کی کم عمری میں پروین شاکر نے اردو شاعری کو جو انداز فراہم کیا، وہ بے مثال تھا۔

بیٹی، پاکستان میں ایک ایسا بھی وقت تھا جب ابنِ صفی کی ’عمران سیریز‘ لڑکوں کے تکیوں کے نیچے ملا کرتی تھیں تو پروین شاکر کی ’خوشبو‘ لڑکیوں کے تکیے تلے۔

اُس روز قریب ایک گھنٹے تک آپ کے دادا روتے رہے۔ شاید میں خود بھی ان کی تکلیف کا اندازہ نہ لگا پاؤں۔ پھر لڑکھڑاتے ہوئے کمرے سے باہر آئے اور برآمدے میں پروین شاکر کی کتاب ’خوشبو‘ لے کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے کچھ صفحات پلٹے ہی تھے کہ اچانک بہت تیز آندھی آئی اور اس کتاب کا ایک پنّا اُڑ کر آنگن میں گر گیا۔ ہم اٹھانے کے لیے آگے بڑھے ہی تھے کہ بارش تیز ہو گئی۔ پیچھے سے ابّا کی آواز آئی، پروین پھوپھو کا مقبول ترین شعر پڑھتے ہوئے—

کچھ تو ہوا بھی سرد تھی، کچھ تھا ترا خیال بھی
دل کو خوشی کے ساتھ ساتھ ہوتا رہا ملال بھی

کہتے ہیں کہ پروین شاکر کو بارش بہت پسند تھی، اور یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہےکہ ان کی پیدائش پر اور اس دنیا سے کوچ کر جانے پر، دونوں ہی وقت تیز برسات نے ان کا استقبال بھی کیا اور انہیں الوداع بھی۔ اس واقعے کے کچھ ہی مہینوں بعد ابّا حضور کا بھی انتقال ہو گیا۔

آپ کے دادا کے چالیسویں پر جب آپ کی پھوپھی آنگن میں رکھے گدّوں پر بچھانے کے لیے چادر تلاش کر رہی تھیں، تب انہیں بشیر بدر کی کتاب *’اکائی‘* ملی۔ وہ اسے لے کر ہمارے پاس آئیں۔ کتاب کی گرد آلود جلد کو صاف کیا تو اس کے پہلے صفحے پر ایک پرانا، زرد پرچہ چپکا ہوا ملا۔ یہ خط تھا جو بشیر بدر نے آپ کے دادا کو کتاب کے ساتھ بھیجا تھا۔ سیاہی کچھ ہلکی پڑ چکی تھی، صرف آخری کے چند جملے پڑھے جا سکے۔ وہ انہی کا ایک شعر تھا —

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

آپ کی دادی نے ہمیں اور آپ کی پھوپھی کو بتایا کہ آپ کے دادا اس سے پہلے بس ایک بار ایسے ٹوٹ کر روئے تھے، جب انہیں ۱۹۸۷ کے میرٹھ دنگوں کے دوران بشیر کے گھر کے جلنے کی خبر ملی تھی۔ اُن دنوں منیر نیازی کی شاعری میں جو تنہائی اور بے قراری کی کیفیت بیان ہوا کرتی تھی، اُس میں آپ کے دادا کو کچھ سکون ملا کرتا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اکیسویں صدی آ گئی اور اُس گزرے دور کے تمام عظیم شعرا اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس دور میں اردو کو نہ صرف قومیت سے جوڑ دیا گیا بلکہ مسلمانیت کا لباس بھی پہنا دیا گیا۔ یہ تفریق تب بھی نہیں کی گئی تھی جب انیسویں صدی میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں للّو لال جی نے *'پریم ساگر'* دیوناگری رسم الخط میں، سنسکرت الفاظ کی کثرت سے تصنیف کی۔ اُس وقت تک ہندوستانی ہندی اور اردو میں تقسیم نہیں ہوئی تھی، اور ہندوستانی نستعلیق میں لکھی جاتی تھی۔ اُس وقت اس آگ نے ہوا نہیں پکڑی تھی۔ لیکن پھر تقسیمِ ہند اور فرقہ وارانہ فسادات کے چلتے اردو اور ہندوستانی کے راستے الگ کر دیے گئے۔ بالآخر اردو شاعری بھی، خصوصاً نستعلیق میں، تنہا ہو گئی۔

مگر مثبت صورت یہ ہے کہ گزرتے وقت کے ساتھ نئے دور کی نسل نے اردو کو پھر سے اپنایا۔ اکیسویں صدی میں جدیدیت اور مابعدِ جدیدیت کے رجحانات کے بعد اب اس نئے دور کے شاعروں میں کچھ ایسے شاعر ہیں جنہوں نے روایتی طور طریقے، مثلاً بحر اور قافیہ، کی پابندیوں کو توڑ کر اپنی شاعری میں ایک نئی زبان کا استعمال کیا، جسے انگریزی میں *'Slang Poetry'* کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ زینب، ان میں سے ایک آپ کی سب سے پسندیدہ پھوپھی اور شاعرہ سبیکا عباس بھی ہیں۔ ہم اس بات سے واقف ہیں کہ آپ دن رات ان کی شاعری سنتی ہیں، اور انہی کی طرح لکھنے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔

البتہ، غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اردو ادب اور شاعری میں محبت اور انقلاب ہمیشہ دوش بہ دوش، باہم چلتے رہے ہیں۔

آپ کو یاد ہے، زینب، جب ہم آپ کو شاہین باغ لے کر گئے تھے؟ ہزاروں کے اُس مجمعے میں ایک نیا ہندوستان بنتا دکھائی دیا تھا، ایک ایسا ہندوستان جو سیاست دانوں کی طاقت کا محتاج نہیں تھا۔

آپ کی پھوپھی سبیکا آپ کو اسٹیج پر لے گئی تھیں، جہاں آپ نے ان کی ایک نظم انہی کے ساتھ پڑھی۔ اور پھر سبیکا نے آمیر عزیز کا استقبال کچھ یوں کیا: ''دوستو، اب ایک ایسے شاعر آ رہے ہیں جن کی نظم ہمارے احتجاج کی آواز بن چکی ہے۔ عام آدمی کی آواز۔ متحد ہندوستان کی آواز۔ میں آمیر عزیز کو دعوت دیتی ہوں۔''

اور پھر جب آمیر عزیز نے 'سب یاد رکھا جائے گا' پڑھنا شروع کیا تو پورا شاہین باغ ایک مشترکہ آواز بن کر گونجا۔ آخرکار تھک ہار کر رات کے قریب تین بجے آپ کیمپ کی دادیوں کے درمیان ہی سو گئی تھیں۔

دل میں ٹیس سی اٹھتی ہے جب دیکھتا ہوں اردو زبان کو آج ہندوستان میں کس قدر کچلا جا رہا ہے۔ مگر امید پر ہی تو دنیا قائم ہے، ہے نا زینب؟

ابھی کچھ روز پہلے جب آپ ٹیوشن گئی تھیں، تو رگھو چچا کا لڑکا بابو مٹھائی لے کر آیا تھا۔ بتا رہا تھا کہ دہلی کے جامعہ کالج میں کیسے فرسٹ ایئر میں اول نمبر پر آیا ہے۔ اردو زبان کا موضوع نکلا تو بتانے لگا، جامعہ میں پہلے دو سال اردو لازم ہے اور وہ آج کل اردو پڑھنا اور لکھنا سیکھ رہا ہے۔ ہم نے جب پوچھا کہ اردو کی تعلیم کس سے حاصل کر رہے ہو، تو بدمعاش ہنس کر کہتا ہے، ''طلحہ انجم اور فارس شفیع کے اردو ریپ سے۔''

اب تو اردو صرف کتابوں تک محصور نہیں رہی۔ اب وہ گلیوں میں گونجتی ہے، بیٹس پر چلتی ہے، اور جلوسوں کا حصہ بنتی ہے۔ طلحہ انجم، فارس شفیع، ینگ اسٹنرز اور بہت سے نئے اردو ریپ آرٹسٹس ہِپ ہاپ اور شاعری کا ایسا ملاپ قائم کر رہے ہیں جس میں انقلاب کی چیخ بھی ہے اور محبت کی سرگوشیاں بھی۔ اور سب سے خوبصورت بات یہ ہے کہ نئی نسل، جو شاید اردو کے کتابی حروف و تحریر سے دور تھی، آج اس ریپ کے وسیلے سے ہی سہی، دوبارہ اس زبان سے آشنا ہو رہی ہے۔

زینب، بابا کی آنکھوں کا تارا، آج اس خط کے ذریعے ہم آپ کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو کتنا خوش نصیب باپ سمجھتے ہیں۔ وجوہات لامحدود ہیں، لیکن ان میں ایک یہ بھی کہ ہم آپ کو اردو میں کافی دلچسپی لیتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ہماری تمنا ہے کہ آپ آگے جا کر اردو کو اپنے طریقے سے سمجھیں، اسے اپنی زبان بنائیں اور اپنے خاندان کی ادبی شناخت کو پرواز دیں۔

آپ ہمارے لیے امید ہیں، زینب۔ ہماری دعا ہے کہ اس ادب کی دنیا میں آپ کی بھی ایک پہچان بنے تاکہ اس خوب صورت زبان کا دل ہمیشہ دھڑکتا رہے—کہیں نہ کہیں، کسی محفل میں، کسی کتاب کے صفحے پر، کسی مشاعرے میں یا کسی معشوق کے لیے لکھی گئی غزل میں۔ بس تا قیامت دھڑکتا رہے۔

اور یاد رکھیں میری جان، اردو کبھی ختم نہیں ہو سکتی، اور اس زبان کا سفر رکے گا نہیں جب تک اس دنیا میں اسے چاہنے والا ایک بھی شخص موجود ہے۔ جگر مرادآبادی نے خوب لکھا ہے —

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے، زمانے سے ہم نہیں

بے شمار پیار اور دعائیں۔
آپ کے ابّا، طٰہٰ